

تفہیم القرآن

(۱۰) النساء

(از رکوع ۱۹ تا ختم سورہ)

لوگ تم سے عورتوں کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں، کہو اللہ تمہیں ان کے معاملہ میں فتویٰ دیتا ہے اور ساتھ ہی وہ احکام بھی یاد دلاتا ہے جو پہلے سے تم کو اس کتاب میں سنائے جا رہے ہیں، یعنی وہ احکام جو اُن یتیم لڑکیوں کے متعلق ہیں جن کے حق تم ادا نہیں کرتے اور جن کے نکاح کرنے سے تم باز رہتے ہو یا لالچ کی بنا پر تم خود ان سے نکاح کر لینا چاہتے ہو، اور وہ احکام جو اُن بچوں کے متعلق ہیں جو بیچارے کوئی زور نہیں رکھتے۔ اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ یتیموں کے ساتھ انصاف بر قائم رہو، اور جو بھلائی تم کو دے وہ اللہ

ﷻ اس کی تعریف نہیں فرمائی تھی کہ عورتوں کے معاملہ میں لوگ کیا پوچھتے تھے۔ مگر آگے چل کر جو فتویٰ دیا گیا ہے اس سے سوال کی نوعیت خود واضح ہو جاتی ہے۔

ﷻ یہ اصل استفادہ کا جواب نہیں ہے بلکہ لوگوں کے سوال کی طرف توجہ فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اُن احکام کی پابندی پر پھر ایک مرتبہ زور دیا ہے جو سورہ کے آغاز میں یتیم لڑکیوں کے متعلق باغضوص اور یتیم بچوں کے متعلق باہم اوصاف فرمائے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ ابتدائی دور کو عورتوں میں ان کے حقوق کے تحفظ کی شدت کے ساتھ تائید کی جا چکی تھی، مگر اس پر اکتفا نہیں کیا گیا، اب جو معاشرتی مسائل کی گفتگو چھڑی تو قبل اس کے کہ لوگوں کے پیش کردہ سوال کا جواب دیا جاتا، یتیموں کے مفاد کا ذکر بطور خود چھیڑ دیا گیا۔

ﷻ اشارہ ہے اُس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہوا ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرتے ہو تو جو عورتیں تم کو پسند آئیں..... " (سورہ نساء، رکوع ۱)

ﷻ تَرْغَبُونَ اَنْ تَنْكِحُوهُنَّ کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اُن سے نکاح کرنے کی رغبت رکھتے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم اُن سے نکاح کرنا پسند نہیں کرتے۔ حضرت عائشہ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں یہی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے، اگر لڑکی مالدار ہونے کے خواہش مند بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور ہم و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں (باقی اگلے صفحہ پر)

کے علم سے چھپی نہ رہ جائے گی۔

جب کسی عورت کو اپنے شوہر سے بدسلوکی یا بے رخصی کا خطرہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں اگر میاں اور بیوی کچھ حقوق کی کمی بیشی پر آپس میں صلح کر لیں۔ صلح بہر حال بہتر ہے۔ نفس تنگ دلی کی طرف جلدی مائل ہو جاتے ہیں، لیکن اگر تم لوگ احسان سے پیش آؤ اور خدا ترسی سے کام لو تو یقین رکھو کہ اللہ تمہارے اس طرز عمل سے بے خبر نہ ہوگا۔

(بقیہ صفحہ سابق) فائدہ اٹھائیں۔ اور اگر وہ بد صورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے تھے اور نہ کسی دوسرے سے اس نکاح ہونے دیتے تھے تاکہ اس کا کوئی ایسا سر دھرایا نہ ہو جائے جو کل اس کے حق کا مطالبہ کرنے والا ہو۔
۵۵ اشارہ ہے ان احکام کی طرف جو اسی سورہ کے پہلے اور دوسرے رکوع میں تینوں کے حقوق کے متعلق ارشاد ہوئے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ۵۴) سہ یہاں سے اصل استفتا کا جواب شروع ہوتا ہے۔ اس جواب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے سوال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا اور ان کثیر التعداد بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورہ نازکی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اس آزادی پر وقف کی پابندیاں فائدہ ہو گئیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل (یعنی مساویانہ برتاؤ) کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے، یا دائم المرض ہے، یا تعلق زین و شو کے قابل نہیں رہی ہے اور شوہر دوسری بیوی میاں لاتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے؟ یکساں محبت رکھے؟ جسمانی تعلق میں بھی یکساں برتنے؟ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے؟ تیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جہانہ ہونا چاہے تو کیا زہین میں اس قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہو چکی ہے وہ اپنے بعض حقوق سے خود دست بردار ہو کر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کرے؟ کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف نہ ہوگا؟ یہی وہ سوال ہیں جن کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔

۵۶ یعنی طلاق و جدائی سے بہتر ہے کہ اس طرح باہم مصالحت کر کے ایک عورت اسی شوہر کے ساتھ رہے جس کے ساتھ وہ عمر کا ایک حصہ گزار چکی ہے۔

۵۷ عورت کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ وہ اپنے خاندان کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جاسکتا ہے۔ مرد کی طرف سے تنگ دلی یہ ہے کہ جو عورت دل سے اتر جائے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو اس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے اور اس کے حقوق ناقابل برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔

۵۸ یہاں پھر اللہ تعالیٰ نے مرد ہی کے جذبہ فیاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعموم ایسے معاملات میں اس کا فائدہ ہے۔ اس نے مرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو بہر حال اس کی (باقی اگلے صفحہ پر)

بیویوں کے درمیان پورا پورا عدل کرنا تمہارے بس میں نہیں ہے، تم چاہو بھی تو اس پر قادر نہیں ہو سکتے، لہذا قانونِ الہی کا نشانہ پورا کرنے کے لیے یہ کافی ہے کہ، ایک بیوی کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو ادھر لٹکتا چھوڑ دو۔ اگر تم اپنا طرز عمل درست رکھو اور اللہ سے ڈرتے رہو تو اللہ چشم پوشی کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ لیکن اگر زمین ایک دوسرے سے الگ ہی ہو جائیں تو اللہ اپنی وسیع قدرت سے ہر ایک کو دوسرے کی محتاجی سے بے نیاز کر دے گا، اللہ کا دامن بہت کشادہ ہے اور وہ دانا و مینا ہے۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کا ہے۔ تم سے پہلے جن کو ہم نے کتاب دی تھی انھیں بھی یہی ہدایت کی تھی اور اب تم کو بھی یہی ہدایت کرتے ہیں کہ خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ لیکن اگر تم نہیں مانتے تو نہ مانو، آسمان و زمین کی ساری چیزوں کا مالک اللہ

(بقیہ سابق) رفیقِ زندگی رہ چکی ہے اور اُس خدا سے ڈرے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب اپنی نظر التفات اس سے پھیرے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر اتر آئے تو پھر اس کا دنیا میں کہیں ٹھکانا نہ رہے۔

(حواشی صفحہ ۱۸) سہ مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام چیزوں سے دوپازانہ بیویوں کے درمیان مساوات نہیں برت سکتا۔ ایک خوبصورت ہے اور دوسری بد صورت، ایک جوان ہے اور دوسری سن رسیدہ، ایک دائم المرض ہے اور دوسری تندرست، ایک بد مزاج ہے اور دوسری خوش مزاج، اور اسی طرح کے دوسرے تفاوت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً آدمی کی رغبت کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتی ہے۔ ایسی حالتوں میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا کہ محبت و رغبت اور جسمانی تعلق میں ضرور ہی دونوں کے درمیان مساوات رکھی جائے، بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دینے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اس کی خواہش کی بنیاد پر بیوی بنائے رکھتے ہو تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر رہ جائے۔ ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری امر ہے لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری یوں متعلق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعددِ ازواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو عملاً منسوخ کر دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے تو یہ نتیجہ نکالا جاسکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا کہ لہذا ایک بیوی کی طرف بالکل نہ جھک پڑو، اس فقرے نے کوئی موقع اُس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو سچی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

سہ یعنی اگر حتی الامکان تم قصداً ظلم نہ کرو اور انصاف ہی سے کام لینے کی کوشش کرتے رہو تو فطری معیروں کی بنیاد پر جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملہ میں صادر ہوں گی انھیں اللہ معاف فرما دے گا۔

ہے اور وہ بے نیاز ہے، ہر تعریف کا مستحق۔ ہاں اللہ ہی مالک ہے ان سب چیزوں کا جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اور کار سازی کے لیے بس وہی کافی ہے۔ اگر وہ چاہے تو تم لوگوں کو ہٹا کر تمھاری جگہ دوسروں کو لے آئے اور وہ اس کی پوری قدرت رکھتا ہے جو شخص محض ثواب دنیا کا طالب ہو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس ثواب دنیا بھی ہے اور ثواب آخرت بھی، اور اللہ سمیع و بصیر ہے۔

۶۹

اسلام بالعموم قانونی احکام بیان کرنے کے بعد اور بالخصوص تمدن و معاشرت کے ان پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے، اللہ تعالیٰ اس قسم کے چند پُر اثر جلوں میں ایک مختصر و مفید ضرور فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو ان احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اوپر چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے لہذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ چند باتیں اہل ایمان کے ذہن نشین کر دی جائیں۔ ایک یہ کہ تم کبھی اس بھلا دوسے میں نہ رہنا کہ کسی کی نعمت کا بنانا اور بگاڑنا تمھارے ہاتھ میں ہے، اگر تم اس سے ہاتھ کھینچ لو گے تو اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا۔ نہیں، تمھاری اور اس کی، سب کی نعمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا ایک تم ہی واحد ذریعہ نہیں ہو۔ اس مالک زمین و آسمان کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔

دوسرے یہ کہ تمھیں اور تمھاری طرح پچھلے تمام انبیاء کی امتوں کو ہمیشہ ہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے ساتھ کام کرو۔ اس ہدایت کی پیروی میں تمھاری اپنی فلاح ہے، خدا کا کوئی فائدہ نہیں، اگر تم اس کی خلاف ورزی کر دو گے تو پچھلی امتوں نے نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑ دیا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمھاری برتا ہے۔ اس کے امر سے انحراف کر دو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سر بلند کر دے گا اور تمھارے بھٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔

تیسرے یہ کہ خدا کے پاس دنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، عارضی اور وقتی فائدے بھی ہیں، پائیدار اور دائمی فائدے بھی۔ اب یہ تمھارے اپنے طرف اور حوصلے اور سمجھت کی بات ہے کہ تم اس سے کس قسم کے فائدے چاہتے ہو۔ اگر تم محض دنیا کے چند روزہ فائدوں ہی پر رکیکتے ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو تو خدا ہی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمھارا کوئی حصہ نہ رہے گا۔ دریا تو تمھاری کھیتی کو بہتک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے مگر یہ تمھارے اپنے طرف کی تسلی اور حوصلہ کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو۔ کچھ طرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کر جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمھارے حصہ میں آئیں۔

آخر میں جو یہ فرمایا کہ اللہ سمیع و بصیر ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اندھا اور بہرا نہیں ہے کہ کسی (باقی اگلے صفحہ پر)

اے ایمان لانے والو! انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد خود تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ خواہ مالدار ہو یا غریب، بہر حال اللہ دونوں سے زیادہ اس کا مستحق ہے کہ تم اس کا لحاظ کرو، لہذا اپنی خوش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی پیٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچا یا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔

اے ایمان لانے والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر ہیت دور نکل گیا۔ رہے

(بقیہ سابق) شاہ بے خبر کی طرح اندھا دھند کام کرنے اور اپنی عمارت بخشش میں بھلے اور بُرے کے درمیان کوئی تمیز نہ کرے۔ وہ پورے باخبری کے ساتھ اپنی اس کائنات پر فرماں روا کی گمراہی ہے، ہر ایک کے ظن اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے، ہر ایک کے اوصاف کو وہ جانتا ہے، اسے خوب معلوم ہے کہ تم میں سے کون کس راہ میں اپنی محنتیں اور کوششیں صرف کر رہا ہے۔ تم اس کی نافرمانی کا راستہ اختیار کر کے ان بخششوں کی امید نہیں کر سکتے جو صرف فرماں برداروں ہی کے لیے مخصوص ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) اللہ یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو، بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا اٹھانا ہے تبھی اس بات پر مکمل تہہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔ عدل کو اپنے قیام کے لیے جس بہارے کی ضرورت ہے، مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا قائم ہو۔

اللہ یعنی تمہاری گواہی محض خدا کے لیے ہونی چاہیے، کسی کی روایت اس میں نہ ہو، کوئی ذاتی مفاد یا خدا کے سوا کسی کی خوشنودی تمہارے مد نظر نہ ہو۔

اللہ ایمان لانے کا ایک مطلب یہ ہے کہ آدمی انکار کے بجائے اقرار کی راہ اختیار کرے، نہ ماننے والوں سے الگ ہو کر ماننے والوں میں شامل ہو جائے۔ ایمان کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ آدمی جس چیز کو مانے اسے سچے دل سے مانے، پھرتی بخیدگی اور خلوص کے ساتھ مانے، اپنی فکر کو، اپنے مذاق کو، اپنی پسند کو، اپنے رویے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو، اپنی سعی و جہد کے مصروف کو بالکل اس عقیدے کے مطابق بدلے جسے ماننے کا وہ دعویٰ کر رہا ہے۔ پس اس آیت میں خطاب ان تمام مسلمانوں سے ہے جو پہلے معنی کے لحاظ سے ماننے والوں میں شمار ہوتے ہیں اور مطالبہ ان سے یہ کیا گیا ہے کہ دوسرے معنی کے لحاظ سے سچے مومن بنیں۔

اللہ کفر کرنے کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی صاف صاف انکار کر دے دوسرا مطلب یہ ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

وہ لوگ جو ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے، تو اللہ ہرگز ان کو معاف نہ کرے گا اور نہ کبھی ان کو راہ راست دکھائے گا۔ اور جو منافق اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں انھیں یہ شر وہ سنا دو کہ ان کے لیے دردناک سزا تیار ہے۔ کیا یہ لوگ عزت کی طلب میں ان کے پاس جاتے ہیں؟ حالانکہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ اللہ اس کتاب میں تم کو پہلے ہی حکم دے چکا ہے کہ جہاں تم سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بجا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں۔ اب اگر تم ایسا کرتے ہو تو تم بھی انہی کی طرح ہو۔ یقین چاہو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے۔ یہ منافق تمھارے معاملہ میں انتظار کر رہے ہیں کہ اونٹ کس کر وٹ بیٹھتا ہے، اگر فتح تمھاری ہوئی تو اگر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اگر کافروں کا پتہ بھاری

(بقیہ سابق) آدمی زبان سے مانے اور دل سے نہ مانے، یا اپنے روتے سے ثابت کر دے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا ہے فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ یہاں کفر سے یہ دونوں معنی مراد ہیں اور آیت کا مقصود لوگوں کو اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ اسلام کے ان اساسی عقیدوں کے ساتھ کفر کی ان دونوں اقسام میں سے جس قسم کا ترناؤ بھی آدمی اختیار کرے گا، اس کا نتیجہ حق سے دوری اور باطل کی راہوں میں گسرتگی و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

(حواشی صفحہ ۱۵) لہذا اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے لیے دین محض ایک غیر سنجیدہ تفریح ہے، ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں جب فضا ئے دماغی میں ایک بہرائی اٹھی، مسلمان ہو گئے اور جب دوسری بہرائی اٹھی، کافر بن گئے۔ یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا، مسلمان بن گئے اور جب معبود منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لیے بے تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔ اور یہ جو فرمایا کہ ”پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے بعد دیگر لوگوں کو بھی اسلام سے پھرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کرے اور اپنی قوت اس سعی و جد میں صرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلہ میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے۔ یہ کفر میں ترقی، اور ایک جرم پر پے در پے جرائم کا اضافہ ہے جس کا وبال بھی مجرّم د کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔

لہذا عزت کا مفہوم عربی زبان میں اُردو کی نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اُردو میں عزت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنی میں آتا ہے مگر عربی میں عزت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس پر دست دمازی نہ کر سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ عزت ”نا قابل ہتک حرمت“ کا ہم معنی ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور پھر بھی ہم نے تم کو مسلمانوں سے بچایا ہے۔
بس اللہ ہی تمہارے اور ان کے معاملہ کا فیصلہ قیامت کے روز کرے گا اور اس فیصلہ میں اللہ نے کافروں کے لیے
مسلمانوں پر غالب آنے کی ہرگز کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انھیں دھوکہ میں ڈال رکھا
ہے۔ جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے کہ مساتے ہوئے اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد
کرتے ہیں۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانوا ڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف۔ جسے اللہ نے

(بقیہ سابق) ص ۱۱۱ یعنی اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ رکھنے کے باوجود کافروں کی ان صجعتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیات الہی
کے خلاف کفر بکا جاتا ہے، اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسول کا مذاق اڑاتے ہوئے سنتا ہے تو اس میں اور
ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

(حواشی صفحہ ۱۱۱) ص ۱۱۱ ہر زمانہ کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جاسکتے ہیں
ان کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرۃ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعہ سے حاصل کرتے ہیں۔ اور جو فائدے کافر ہونے کی
حیثیت سے حاصل ہونے ممکن ہیں ان کی خاطر یہ کفار سے جا کر ملتے ہیں اور ہر طریقہ سے ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی متعصب
مسلمان نہیں ہیں، نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری وفاداریاں تمہارے ساتھ ہیں، فکری اور تہذیبی اور ہر
طرح کی موافقت تمہارے ساتھ ہے اور کفر و اسلام کی کشمکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمہارے ہی پلڑے میں پڑے گا۔
علیہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند
نہ ہو جس طرح تمام ذہبی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی نمبر کے بلاغہ شریک نہ ہونے کو اس کی عدم دلچسپی پر محمول کرتی
ہیں اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر رہنے پر اسے نمبر سے خارج کر دیتی ہیں اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نماز
باجاماعت سے غیر حاضر رہنا اس زمانہ میں اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، اور اگر
وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانہ میں
پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار کیے ہی نہ جاسکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو
بچھا بل ایمان سے میسر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے، وقت سے پہلے مسجدوں میں پہنچ جاتے تھے، نماز
سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھہرے رہتے تھے، اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے۔
مخلاف اس کے اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پرین جاتی تھی، دل پر جیر کر کے اٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا
تھا کہ آ نہیں رہا ہے بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لارہا ہے، جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو دہائی اگلے صفحہ پر

بٹکا دیا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پاسکتے۔

اے ایمان لانے والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف مزین حجت دیدو؟ یقین جانو کہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں جائیں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ البتہ جوان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ

(بقیہ سابق) بھائی ملی ہے، اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔

(حواشی صفحہ ہذا) سہ یعنی جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسول کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچائی سے منحرف اور باطل پرستی کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا، اور جس کی ضلالت طبعی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت ہی کے راستے کھول دیے ہوں، ایسے شخص کو راہ راست دکھانا اور حقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ ہدایت کا معاملہ رزق کی طرح ہے جس طرح یہ حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضہ قدرت میں ہیں، جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے اور اللہ ہر شخص کو اسی راستہ سے رزق دیتا ہے جس راستے سے وہ خود مانگتا ہے، جو شخص رزق حلال کا طالب ہو اور اس کے لیے کوشش کرے اللہ اس کے لیے حلال راستوں کو کھول دیتا ہے اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے اسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے، اور جو شخص حرام خوری پر تلا ہوا ہوتا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے اس کو حرام ہی کی روٹی ملتی ہے اور اس کے نصیب میں رزق حلال لکھ دینا کسی کے بس میں نہیں ہوتا، بالکل اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر نہیں چل سکتا، البتہ یہ بات کہ کس انسان کو کس راہ پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی رہروی کے اسباب اس کے لیے ہموار کیے جاتے ہیں، اس کا انحصار سراسر اس آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے۔ اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے، بپائی کا طالب ہے، اور خالص نیت سے خدا کے راستے پر چلنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ اسی کا اذن اور اسی کی توفیق اسے عطا فرماتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے موافق کر دیتا ہے۔ بخلاف اس کے جو شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راستوں ہی پر چلنے کی سعی کرتا ہے، اللہ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں میں اپنی قوتیں صرف کرنے سے بچالینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہ راست جس نے خود کھودی اور جس سے اللہ نے اس کو محروم کر دیا

(باقی اگلے صفحہ پر)

تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزار بندے بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ بڑا قادر دان ہے اور سب کے حال سے واقف ہے۔

بدگوئی پر زبان کھولنا اللہ کو پسند نہیں، اتنا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو، اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے، مظلوم ہونے کی صورت میں اگرچہ تم کو بدگوئی کا حق ہے، لیکن اگر تم ظاہر و باطن میں بھلائی ہی کیے جاؤ، یا کم از کم بُرائی سے درگزر کرو، تو اللہ کی صفت بھی یہی ہے کہ وہ بڑا معاف کرنے والا ہے حالانکہ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔

(تبیہ ساتھی) اس کے لیے یہ گم خندہ نعمت کسی کے ڈھونڈنے نہیں مل سکتی۔

۱۱ اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیاں اور محنتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اسے قربان نہ کیا جاسکتا ہو۔

(حاشیہ صفحہ ۱۲) ان شکر کے اصل معنی اعترافِ نعمت یا احسانِ خدی کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فرماؤ گے اور تمہاری حاجی کا رد یہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر اس کے احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں کہ اللہ خواہ مخواہ تمہیں سزا دے۔

ایک محسن نے مقابلہ میں صحیح احسان نہ رو تیر ہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دنی سے اس کے احسان کا اعتراف کرے، زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسانِ خدی کا ثبوت دے۔ انہی تین چیزوں کے مجموعہ کا نام شکر ہے۔ اور اس ذکر کا اقصا یہ ہے کہ دلائلِ آدمی احسان کو اسی کی طرف منسوب کرے جس نے دراصل احسان کیا ہے، کسی دوسرے کو احسان کے شکر یہ اور نعمت کے اعتراف میں اس کا حصہ دار نہ بنائے۔ مثلاً آدمی کا دل اپنے محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبہ سے بہرہ ور ہو اور اس کے مخالفوں سے محبت و خلاص اور وفاداری کا ذرہ برابر تعلق بھی نہ رکھے۔ مثلاً وہ اپنے محسن کا مطیع و فرمانبردار ہو اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کے منشاء کے خلاف استعمال نہ کرے۔

۱۲ اصل میں لفظ "شکر" استعمال ہوا ہے جس کا تہجیدیم نے قدر دان کیا ہے۔ شکر حبِ اللہ کی طرف سے بندے کی جانب ہوتا ہے اس کے معنی "اعترافِ خدمت یا قدر دانی کے ہوں گے اور حبِ بندے کی طرف سے اللہ کی جانب ہوتا ہے اس کو احترامِ نعمت یا احسانِ خدی کے معنی میں دیا جائے گا۔ اللہ کی طرف سے بندوں کا شکر یہ ادا کیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ قادرِ شناس نہیں ہے، جتنی اور جیسی خدمات بھی بندے اس کی راہ میں انجام دیتے ہیں، اللہ کے ہاں ان کی قدر کی جاتی ہے، ان کی تعریف کی جاتی ہے، جتنی تعریف

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں، اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے، اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں، وہ سب پلے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے وہ سزا مہیا کر رکھی ہے جو انھیں ذلیل و خوار کر دینے والی ہوگی۔ بخلاف اس کے جو لوگ اللہ اور اس کے تمام رسولوں کو مانیں اور ان کے درمیان تفریق نہ کریں ان کو ہم ضرور ان کے اجر عطا کریں گے، اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

۴۱

(بقیہ سابق) کسی کی خدمات علیہ کا فام سے محروم نہیں رہیں، بلکہ وہ نہایت فیاضی کے ساتھ ہر شخص کو اس کی خدمت سے زیادہ صلہ دیتے ہیں۔ بندوں کا حال تو یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے کیا اس کی قدر کم کرتے ہیں اور جو کچھ نہ کیا اس پر گرفت کرنے میں بڑی سختی دکھاتے ہیں۔ لیکن اللہ کا حال یہ ہے کہ جو کچھ آدمی نے نہیں کیا ہے اس پر حما سبہ کرنے میں وہ بہت نرمی اور چشم پوشی سے کام لیتا ہے اور جو کچھ کیا ہے اس کی قدر اس کے مرتبے سے بڑھ کر کرتا ہے۔

۱۱۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ایک بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق اور یہودی اور عبت پرست نسب کے سب اس وقت ہر ممکن طریقہ سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نئی تحریک کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں کے اندر نفرت اور غصہ کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کے جذبات کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا تمہارے خدا کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تم مظلوم ہو اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اسے حق پہنچتا ہے لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ خفیہ ہو یا علانیہ حال میں بھلائی کیے جاؤ اور بڑائیوں سے درگزر کرو، کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے جس طرح خدا حلیم اور بردبار ہے، سخت سے سخت جرموں تک کو رزق دیتا ہے، بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے، اسی طرح تم بھی عالی حوصلہ اور وسیع الطرف بنو۔

(حواشی صفحہ ہذا) ۱۱۔ یعنی کافر ہونے میں وہ لوگ جو نہ خدا کو مانتے ہیں نہ اس کے رسولوں کو، اور وہ جو خدا کو مانتے ہیں مگر رسولوں کو نہیں مانتے، اور وہ جو کسی رسول کو مانتے ہیں اور کسی کو نہیں مانتے سب یکساں ہیں۔ ان میں سے کسی کے کافر ہونے میں ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں۔

۱۲۔ یعنی جو لوگ خدا کو اپنا واحد الہ و رب تسلیم کر لیں اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں کی پیروی قبول کریں صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں، اور وہ جس درجہ کا عمل صالح کریں گے اسی درجہ کا اجر پائیں گے۔ رہے وہ لوگ جنھوں نے

یہ اہل کتاب اگر آج تم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ تم آسمان سے کوئی تحریر مان پر نازل کرادو تو اس سے بڑھ چڑھ کر مجرمانہ مطالبہ یہ پہلے مولیٰ سے کر چکے ہیں۔ اس سے تو انھوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو علانیہ دکھا دو اور اسی سرکشی کی وجہ سے یکایک ان پر کھلی ٹوٹ پڑی تھی۔ پھر انھوں نے پھر طے کو اپنا معبود بنالیا، حالانکہ یہ کھلی کھلی نشانیاں دیکھ چکے تھے۔ اس پر بھی ہم نے ان سے درگزر کیا۔ ہم نے موسیٰ کو صریح فرمان عطا کیا اور ان لوگوں پر طور کو اٹھا کر ان سے (اس فرمان کی اطاعت کا) عہد لیا۔ ہم نے ان کو حکم دیا کہ دروانہ میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے داخل ہو۔ ہم نے ان سے کہا کہ سبت کا قانون نہ توڑو اور اس پر ان سے پختہ عہد لیا۔ آخر کار ان کی عہد شکنی کی وجہ سے

(بقیہ سابق) خدا کی لائٹریک الہیت دروبیت ہی تسلیم نہ کی، یا جنھوں نے خدا کے نمائندوں میں سے بعض کو قبول اور بعض کو رد کرنے کا باغیانہ طرز عمل اختیار کیا، تو ان کے لیے کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا، کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے۔

۱۱ یعنی جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے ان کا حراب لینے میں اللہ سخت گیری نہیں برتے گا بلکہ ان کے ساتھ بہت زیادہ نرمی اور درگزر سے کام لے گا۔

روحانی صفحہ ۱۱) ۱۱ مدینہ کے یہودی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جو عجیب عجیب مطالبے کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص کے نام اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ یہ محمد ہمارے رسول ہیں، ان پر ایمان ۱۱ یہاں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے اس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔

۱۱ اس کا ذکر سورہ بقرہ رکوع ۶ میں گزر چکا ہے۔

۱۱ کھلی کھلی نشانوں سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رسول مقرر ہو کر مہر پہنچنے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے درپے ان لوگوں کے مشاہدے میں آچکی تھیں ظاہر ہے کہ سلطنت مصر کی عظیم شان طاقت کے بخوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا وہ کوئی گائے کا بچہ نہ تھا بلکہ اللہ رب العالمین تھا۔ مگر یہ اس قوم کی باطن پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت و عبادت کی عقل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور شاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جھکی تو اپنے محسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک پھر طے کی مصنوعی صورت ہی کے آگے جھکی۔ ۱۱ صریح فرمان سے مراد وہ احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تختیوں پر لکھ کر دیے گئے تھے سورہ اعراف رکوع ۱۷ میں اس کا ذکر زیادہ تفصیل کے ساتھ آئے گا۔ اور عہد سے مراد وہ میثاق ہے جو کوہ طور کے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا، متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، یہاں تک کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ حالانکہ درحقیقت ان کی باطل پرستی کے سبب سے اللہ نے ان پر چھپ گنا دیا ہے اور اسی وجہ سے یہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ پھر اپنے کفر میں اتنے بڑھے کہ مریم پر سخت بہتان لگایا اور خود کہا کہ ہم نے مسیح،

(بقیہ سابق) دامن میں بنی اسرائیل کے نمائندوں سے ایسا کیا تھا۔ سورہ بقرہ رکوع ۸ میں اس کا ذکر گزر چکا ہے اور اعراف رکوع ۲۱ میں پھر اس کی طرف اشارہ آئے گا۔

۱۔ بقرہ رکوع ۶

۲۔ بقرہ رکوع ۸

(حواشی صفحہ ۲۱) ۱۔ یہودیوں کے اس قول کی طرف سورہ بقرہ رکوع ۱۱ میں بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ لوگ تمام باطل پرست جہلاء کی طرح اس بات پر فخر کرتے تھے کہ جو خیالات اور تفصیلات اور رسم و رواج ہم نے اپنے باپ دادا سے پاسے ہیں ان پر ہمارا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ کسی طرح ہم ان سے نہیں ہٹا سکتے جب کبھی خدا کی طرف سے پیغمبروں نے اگر ان کو سمجھانے کی کوشش کی، انھوں نے ان کو یہی جواب دیا کہ تم خواہ کوئی دلیل اور کوئی آیت لے آؤ، ہم تمہاری کسی بات کا اثر نہ لیں گے، جو کچھ مانتے اور کرتے چلے آئے ہیں وہی مانتے رہیں گے اور وہی کیے چلے جائیں گے۔

۲۔ یہ تبیلہ معترضہ ہے۔

۳۔ یہ فقرہ اصل مسئلہ تفریق سے تعلق رکھتا ہے۔

۴۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا معاملہ یہودی قوم میں فی الواقع ذرا برابر بھی مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوئے تھے اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنا دیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزے کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی مجرم کا جہاں ایک شریف ترین مشہور و معروف مذہبی گھرانے کی بی بی اسی لڑکی کو دیں بچہ لیے ہوئے آئی اور قوم کے بڑے اور چھوٹے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پرجوم کر کے آگئے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت میں کہا کہ اس بچہ سے ہم کیا پوچھیں جو کہو اسے میں یثا ہوا ہے۔ مگر کیا ایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اِنِّی عَبْدُ اللّٰهِ اَنْشِیْ الْکِتٰبَ وَجْعَلْنِیْ نَبِیًّا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں، اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ (سورہ مریم رکوع ۲)۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس شبہ کی ہمیشہ کے لیے جڑ کاٹ دی تھی جو ولادت مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے نہ حضرت مریم پر نہ ان کا الزام لگایا، نہ حضرت عیسیٰ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا، لیکن جب حضرت معروف نبوت کے منصب پر عملاً موز ہوئے اور آپ نے یہودیوں (باقی اگلے صفحہ پر)

عیسیٰ ابن مریم، رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے۔ حالانکہ فی الواقع انھوں نے نہ اس کو قتل کیا نہ صلیب پر چڑھایا۔ بلکہ معاملہ ان کے لیے مشتبہ کر دیا گیا۔ اور جن لوگوں نے اُس کے بارے میں اختلاف کیا ہے وہ بھی دراصل شک میں مبتلا ہیں، ان کے پاس اس معاملہ میں کوئی علم نہیں ہے، محض گمان ہی کی پیروی ہے۔ یقیناً انھوں نے مسیح کو قتل نہیں

(بقیہ سابق) ان کی بد اعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، ان کے علماء و فقہاء کو ان کی رہا کاریوں پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زلزلہ پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے، اور اُس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عطا قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا، تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اُتر آئے، اور اس وقت انھوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ زانیہ ہیں اور عیسیٰ ابن مریم ولد الزنا ہیں، حالانکہ یہ ظالم یاقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی حقیقی مشبہ کا نتیجہ نہ تھا جو آدمی ان کے دلوں میں موجود ہوتا، بلکہ خالص بہتان تھا جو انھوں نے جان بوجھ کر محض حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اسے ظلم اور جھوٹ کے بجائے نافر قرار دیا ہے کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔

(خواہشی صفحہ ۱۱) یعنی جرأت مجرمانہ اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے تھے اور پھر اس کو اپنی دانستہ میں قتل کر ڈالا اور فریاد کیا کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے۔ اور ہم نے گہوارے کے واقعہ کا جو حوالہ دیا ہے اُس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انھوں نے حضرت مریم سے مشاہدہ کیں (جن کا ذکر سورہ آل عمران رکوع ۵ میں گذر چکا ہے) ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ ہو چکا تھا کہ آل جناب اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اس لیے واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ان کا بکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے پیغمبر بن کر آیا ہے۔

ﷺ یہ پھر جملہ معترف ہے۔

ﷺ بہ آیت تصریح کرتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے جانے سے پہلے اٹھائے گئے تھے نہ کہ اس کے بعد۔ غالباً پادرس کی عدالت میں توہینِ آپ کی ہوئی تھی، مگر جب وہ سزائے موت کا فیصلہ سنا چکا، اور جب یہودیوں نے مسیح جیسے پاک نفس انسان کے مقابلہ میں ایک ڈاکو کی جان کو زیادہ قیمتی ٹھیکر کر اپنی حق دشمنی و باطل پسندی پر آخری ہرنگا دی، تب اللہ تعالیٰ نے کسی وقت آنجناب کو اٹھایا۔ اللہ میں یہودیوں نے جس شخص کو صلیب پر چڑھایا وہ آپ کی ذات مقدس

(باقی اگلے صفحہ پر)

کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی طرف اٹھالیا، اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔ اور اہل کتاب میں سے

(بقیہ سابق) نہ تھی بلکہ کوئی اور شخص تھا جس کو نہ معلوم کس وجہ سے ان لوگوں نے عیسیٰ ابن مریم سمجھ لیا۔ تاہم ان کا جرم اس سے کم نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس کو انھوں نے کانٹوں کا تاج پہنایا، جس کے منہ پر تھوکا اور جسے ذلت کے ساتھ صلیب پر چڑھایا اس کو وہ عیسیٰ بن مریم ہی سمجھ رہے تھے۔

یہ معلوم کرنے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ معاملہ کس طور پر مشتبہ کیا گیا۔ چونکہ اس باب میں کوئی یقینی ذریعہ معلومات نہیں ہے اس لیے مجرد قیاس و گمان اور افواہوں کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس شبہ کی نوعیت کیا تھی جس کی بنا پر یہودی یہ سمجھے کہ انھوں نے عیسیٰ ابن مریم کو صلیب دی ہے درآں حالے کہ عیسیٰ ابن مریم ان کے ہاتھ سے کل چکے تھے۔

۱۰ اختلاف کرنے والوں سے مراد عیسائی ہیں اور عیسائیوں میں بھی مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک متفق علیہ قول نہیں ہے بلکہ مبسوط اقوال میں جن کی کثرت خود اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مشتبہ ہی رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جیسے یہودی اور رومی سپاہیوں کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیح ہی کو گیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی بلکہ اتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انھوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم دیش دس مرتبہ اپنے مختلف حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا مگر انوبیت کی رُوح جو ان میں تھی وہ اٹھالی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

(حواشی صفحہ بڑا) ۱۱۔ یہ اس معاملہ کی اصل حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے۔ اس میں جرم اور صحت کے ساتھ جو چیز تائی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا۔ اب رہا یہ سوال کہ اٹھا لینے کی کیفیت کیا تھی، تو اس کے متعلق کوئی تفصیل قرآن میں نہیں بتائی گئی۔ قرآن نہ اس کی تصریح کرتا ہے کہ اللہ ان کو جسم و روح کے ساتھ کہ زمین سے اٹھا کر آسمانوں پر کہیں لے گیا، اور نہ ہی صاف کہتا ہے کہ انھوں نے زمین پر طبعی موت پائی اور صرف ان کی روح اٹھائی گئی۔ اس لیے نہ تو قطعی طور پر ان میں سے کسی ایک پہلو کی نفی کی جاسکتی ہے اور نہ اثبات۔ لیکن قرآن کے انداز بیان پر غور کرنے سے یہ بات بالکل نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اٹھائے جانے کی نوعیت و کیفیت خود کچھ بھی ہو بہر حال مسیح علیہ السلام کے ساتھ اللہ نے کوئی ایسا معاملہ ضرور کیا ہے جو غیر معمولی نوعیت کا ہے۔ اس غیر معمولی پن کا اظہار تین چیزوں سے ہوتا ہے ۱

(باقی اگلے صفحہ پر)

(باقی حاشیہ صفحہ سابق)

ایک یہ کہ عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و روح سمیت اٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ان اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ الوہیت مسیح کا قائل ہوا ہے، لیکن قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہ وہی رفع (Ascension) کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اس واقعہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کتاب میں کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی خیال کی تردید کرنا چاہتی ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کو فرید تقویت پہنچانے والی ہو۔

دوسرے یہ کہ اگر مسیح علیہ السلام کا اٹھایا جانا ویسا ہی اٹھایا جانا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دنیا سے اٹھایا جاتا ہے یا اگر اس رفع سے مراد محض درجات و مراتب کی بلندی ہوتی جیسے حضرت ادریس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ رَفَعْنَاهُ مَكَانًا عَلِيًّا، تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے زیادہ مناسب لفاظ یہ ہو سکتے تھے کہ یَقِيْنًا انھوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو زندہ بچا لیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے اس کو ذلیل کرنا چاہا تھا مگر اللہ نے اس کو بلند درجہ عطا کیا۔

تیسرے یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورہ میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اُسے اللہ نے اٹھالیا تو اس کا ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا کہ ”اللہ زبردست طاقت رکھنے والا اور حکیم ہے۔“ یہ تو صرف کسی ایسے واقعہ کے بعد ہی موزوں و مناسب ہو سکتا ہے جس میں اللہ کی قوتِ قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

اس کے جواب میں قرآن سے اگر کوئی دلیل پیش کی جا سکتی ہے تو وہ زیادہ سے زیادہ صرف یہ ہے کہ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے مُتَوَفِّيكَ کا لفظ استعمال کیا ہے (رکوع ۶)۔ لیکن جیسا کہ وہاں ہم حاشیہ میں واضح کر چکے ہیں، یہ لفظ طبعی موت کے معنی میں مرتب نہیں ہے بلکہ قبض روح اور قبض روح جسم دونوں پر دلالت کر سکتا ہے، لہذا یہ ان قرائن کو ملاحظہ کرنے کے لیے کافی نہیں ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ بعض لوگ جن کو مسیح کی طبعی موت کا حکم لگانے پر اصرار ہے، سوال کرتے ہیں کہ توفی کا لفظ قبض روح جسم دونوں پر استعمال ہونے کی کوئی اور نظیر بھی ہے؟ لیکن جب کہ قبض روح جسم کا واقعہ تمام نوریع انسانی کی تاریخ میں پیش ہی ایک مرتبہ آیا ہو تو اس معنی پر اس لفظ کے استعمال کی نظیر پوچھنا محض ایک بے معنی بات ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا اصل لغت میں اس استعمال کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اگر ہے تو ماننا پڑے گا کہ قرآن نے رفع جسمانی کے عقیدہ کی تردید کرنے کے بجائے یہ لفظ استعمال کر کے ان قرائن میں ایک اور قرینہ کا اضافہ کر دیا ہے جن سے اس عقیدہ کو الٹی مدد ملتی ہے، ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ موت کے مرتب لفظ کو چھوڑ کر وفات کے محتمل اُمنعین لفظ کو ایسے موقع پر استعمال کرتا جہاں رفع جسمانی کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ایک فاسد اعتقاد یعنی الوہیت مسیح کے اعتقاد کا موجب بن رہا تھا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ اُن پر گواہی دے گا۔
— غرض اِن یہودی بن جانے والوں کے اسی ظالمانہ رویہ کی بنا پر، اور اس بنا پر کہ یہ بکثرت اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، اور سود دیتے ہیں جس سے انھیں منع کیا گیا تھا، اور لوگوں کے اِن ناجائز طریقوں سے کھاتے ہیں

(بقیہ سابق) پس قرآن کی روح سے زیادہ مطابقت اگر کوئی طرز عمل رکھتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ رفع جسمانی کی تصریح سے بھی اجتناب کیا جائے اور موت کی تصریح سے بھی، بلکہ مسیح علیہ السلام کے اٹھائے جانے کو اللہ تعالیٰ کی قدرتِ قاهرہ کا ایک غیر معمولی ظہور سمجھتے ہوئے اس کی کیفیت کو اسی طرح محض چھوڑ دیا جائے جس طرح خود اللہ تعالیٰ نے محض چھوڑ دیا ہے۔

(حواشی صفحہ ۱۵۱) اس فقرے کے دو معنی بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا یکساں احتمال ہے۔ ایک معنی وہ جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں، دوسرے یہ کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح پر ایمان نہ لے آئے۔ اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مسیح کی طبعی موت جب واقع ہوگی اس وقت جتنے اہل کتاب موجود ہوں گے وہ سب ان پر (یعنی ان کی رسالت پر) ایمان لائے ہوئے ہوں گے۔ دوسرے معنی کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہل کتاب پر مرنے سے عین قبل رسالتِ مسیح کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ ترجیح پر ایمان لے آتے ہیں۔ مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں معنی متعدد صحابہ تابعین اور کابر مفسرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ ہی کے علم میں ہے۔

۱۵۱ یعنی جو کچھ ان اہل کتاب نے مسیح علیہ السلام اور اس پیغام کے ساتھ کہ جو آپ مانے تھے، اس پر خداوند تعالیٰ کی عدالت میں آپ ان کے خلاف گواہی دیں گے۔

۱۵۲ جبکہ مقررہ ختم ہونے کے بعد یہاں سے پھر اصل سلسلہ تقریر شروع ہوتا ہے جو اوپر سے چلا آ رہا ہے۔
۱۵۳ یعنی صرف اسی پر اتکا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں، بلکہ اس قدر بے باک مجرم بن چکے ہیں کہ خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو تحریک اٹھتی ہے، اکثر اس کے پیچھے یہودی دماغ اور یہودی سرمایہ ہی کام کرتا نظر آتا ہے، اور راہ حق کی طرف بلانے کے لیے جو تحریک شروع ہوتی ہے اکثر اس کے مقابلے میں یہودی ہی سبب سے بڑھ کر مڑا حتم بنتے ہیں، اور حالے کہ یہ کم سخت کتاب اللہ کے حامل اور انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کا تارہ ترین جرم یہ اشتراکِ تحریک ہے جسے یہودی دماغ نے اختراع کیا اور یہودی رہنمائی ہی نے بردار چڑھایا ہے۔ ان نام نہاد اہل کتاب کے نصیب میں یہ جرم بھی مقدر تھا کہ دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظامِ زندگی اور نظامِ حکومت خدا کے مرتبہ انکار پر، خدا سے کلمہ کمال دشمنی پر، خدا پرستی کو بخانینہ کے علی الاعیان غم دار و بد پر تعمیر کیا گیا اس کے مجدد و مخترع اور بانی و سربراہ کا یہ مومن علیہ السلام کے نام لیا ہوا ہے۔

ہم نے وہ پاک چیزیں ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں، اور جو لوگ ان میں سے کافر ہیں ان کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ مگر ان میں جو لوگ پختہ علم رکھنے والے ہیں اور ایمان دار ہیں وہ سب اس تعلیم پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور جو تم سے پہلے نازل کی گئی تھی۔ اس طرح کے ایمان لانے والے اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنے والے اور اللہ اور اس کے رسول پر سچی عقیدہ رکھنے والے لوگوں کو ہم ضرور

(بقیہ سابق) وہ توراۃ میں بالفاظ صریح یہ حکم موجود ہے کہ :-

”مگر تمہارے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تم سے پاس رہتا ہو قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرو رکھ بھی لے تو سود ج کے ڈوبنے تک اس کو واپس کر دینا کیونکہ فقط وہی اس کا ایک اوڑھنا ہے، اس کے جسم کا وہی لباس ہے، پھر وہ کیا اوڑھ کر سونے گا۔ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اس کی سنوں گا کیونکہ میں ہریان ہوں“ (خریج باب ۲۲: ۲۵-۲۶)

لیکن اس کے باوجود اسی تورات کے ماننے والے یہودی آج دنیا کے سب سے بڑے سود خوار ہیں اور اپنی تنگ دلی و سنگ دلی کے لیے ضرب المثل بن چکے ہیں۔

(حواشی صفحہ ۵۱) اللہ یعنی اللہ کی پیدا کی ہوئی پاک چیزیں استعمال کرنے کا جو حق ان کو دیا گیا تھا وہ ان کی اس مسلسل بغاوت کی وجہ سے واپس لے لیا گیا، اللہ سے بغاوت کر کے اب جو کچھ وہ اس کی زمین میں کھا رہے ہیں حرام کھا رہے ہیں، جن ذرائع سے استفادہ کر رہے ہیں، لا کسی حق کے کو رہے ہیں، اب وہ اللہ کی نگاہ میں خارج از حد قانون (outlaw) ہیں۔

اللہ یعنی اس قوم کے جو لوگ ایمان و اطاعت سے منحرف اور بغاوت و انکار کی روش پر قائم رہیں ان کے لیے

خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں جو جہنم کا سزا ان کو ملی اور بل رہی ہے وہ کبھی کسی دوسری قوم کو نہیں ملی۔ دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو غارت کا ٹھکانا یا تشر نہیں، دنیا میں بتر بتر کر رہے گئے ہیں اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں، کوئی دور ایسا نہیں گزر رہا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خطہ میں ذلت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہوں اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انہیں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ پھر غصہ یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی اور مٹتی ہیں مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی، اس کو دنیا میں کایموت فیھا ولا یمنیٰ کی سزا دی گئی ہے تاکہ قیامت تک دنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگذشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتا بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلہ میں باغیانہ جہازیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے۔ رہی آخرت تو ان شاء اللہ وہاں کا عذاب اس کے (باقی اگلے صفحہ پر)

اجر عظیم عطا کریں گے۔

اے محمد! ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔ ہم نے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، عیسیٰ، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھیجی۔ ہم نے داؤد کو زبور دی۔ ہم نے ان رسولوں پر بھی وحی نازل کی جن کا ذکر ہم اس سے پہلے تم سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کا ذکر تم سے نہیں کیا۔ ہم نے موسیٰ سے اس طرح گفتگو کی جس طرح گفتگو کی جاتی ہے۔ یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے، صرف اس لیے کہ ان پیغمبروں کو مبعوث کر دینے کے بعد

(بقیہ سابق) بھی زیادہ دردناک ہوگا۔

تلم یعنی ان میں سے جو لوگ کتب آسمانی کی حقیقی تعلیم سے واقف ہیں اور ہر قسم کے تعصب، جاہلانہ ضد، آبائی تقلید اور نفس کی بندگی سے آزاد ہو کر اس امر حق کو سچے دل سے مانتے ہیں جس کا ثبوت آسمانی کتابوں سے ملتا ہے ان کی روش کا فرد ظالم یہودی کی عام روش سے بالکل مختلف ہے۔ ان کو بیک نظر محسوس ہو جاتا ہے کہ تم دین کی تعلیم پچھلے انبیاء نے دی تھی اسی کی تعلیم قرآن دے رہا ہے اس لیے وہ بے لاگ حق پرستی کے ساتھ دونوں پر ایمان لے آتے ہیں۔

(حواشی صفحہ ہذا) تلم اس سے مراد مقصود ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی چیز لے کر نہیں آئے ہیں جو پہلے نہ آئی ہو۔ ان کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں دنیا میں پہلی مرتبہ ایک نئی چیز پیش کر رہا ہوں۔ بلکہ دراصل ان کو بھی اسی ایک منبع علم سے ہدایت ملی ہے جس سے تمام پچھلے انبیاء کو ہدایت ملتی رہی ہے، اور وہ بھی اسی ایک صداقت و حقیقت کو پیش کر رہے ہیں جسے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیدا ہونے والے پیغمبر ہمیشہ سے پیش کرتے چلے آئے ہیں۔

تلم وحی کے معنی میں اشارہ کرنا، دل میں کوئی بات ڈالنا، خفیہ طریقے سے کوئی بات کہنا، پیغام بھیجنا۔

تلم دوسرے انبیاء علیہم السلام پر تو وحی اس طرح آتی تھی کہ ایک آواز آرہی ہے یا فوشتہ پیغام سنا رہا ہے اور وہ سن رہے ہیں۔ لیکن موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہ خاص معاملہ نہ لایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان سے گفتگو کی۔ بندے اور خدا کے درمیان اس طرح باتیں ہوتی تھیں جیسے دو شخص آپس میں بات کرتے ہیں۔ مثال کے لیے اس گفتگو کا حوالہ کافی ہے جو سورہ طہ میں نقل کی گئی ہے۔ تلم یعنی ان سب کا ایک ہی کام تھا اور وہ یہ کہ جو لوگ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیم پر ایمان لائیں اور اپنے رویہ کو اس کے مطابق درست کر لیں انھیں فلاح و سعادت کی خوشخبری سنا دیں اور جو فکر و عمل کی غلط راہوں پر چلتے رہیں ان کو اس غلط روی کے برے انجام سے آگاہ کر دیں۔

لوگوں کے لیے اللہ پر کوئی حجت باقی نہ رہے اللہ پر حال غالب رہنے والا اور حکیم و دانہ ہے۔ دیر لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر ملائکہ بھی گواہ ہیں اگرچہ اللہ کا گواہ ہونا بالکل کفایت کرتا ہے۔ جو لوگ اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں اور خدا کے راستہ میں مانع و مزاحم بنتے ہیں وہ یقیناً اگر اسی میں حق سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ یقیناً جن لوگوں نے انکار و بغاوت کا طریقہ اختیار کیا اور ظلم و ستم پر اتر آئے اللہ ان کو ہرگز معاف نہ کرے گا اور انھیں کوئی راستہ بجز جہنم کے راستہ کے نہ دکھائے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

لوگو! یہ رسول تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے حق لے کر آگیا ہے، ایمان لے آؤ، تمہارے ہی لیے بہتر ہے، اور اگر انکار کرتے ہو تو جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ علیم بھی ہے اور حکیم بھی۔

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کی طرف حق کے سوا کوئی بات منسوب نہ کرو۔ مسیح عیسیٰ

۱۰ یعنی ان تمام پیغمبروں کے بھیجنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر اتمام حجت کرے اور آخری عدالت کے موقع پر کوئی گمراہ مجرم خدا کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ آپ نے ہمیں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام کیا ہی نہ تھا۔ اسی تعرض کے لیے خدا نے دنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر تعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ یا تو خود اس پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہ راست معلوم تھی اور انھوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا مگر انھیں آگاہ نہ کیا۔

۱۱ یعنی زمین و آسمان کے مالک کی نافرمانی کر کے تم اس کا کوئی نقصان نہیں کر سکتے۔ نقصان جو کچھ ہو گا تمہارا اپنا ہو گا۔ ۱۲ یعنی تمہارا خدا نہ تو بے خبر ہے کہ اس کی سلطنت میں رہتے ہوئے تم شرارتیں کرو اور اسے معلوم نہ ہو، اور نہ وہ نادان ہے کہ اسے اپنے فرامین کی خلاف ورزی کرنے والوں سے نمٹنے کا طریقہ نہ آتا ہو۔

۱۳ یہاں اہل کتاب سے مراد عیسائی ہیں اور غلو کے معنی ہیں کسی چیز کی تائید و حمایت میں حد سے (باقی اگلے صفحہ پر)

ابن مریم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اللہ کا ایک رسول تھا اور ایک فرمان تھا جو اللہ نے مریم کی طرف بھیجا اور ایک روح تھی اللہ کی طرف سے (جس نے مریم کے رحم میں بچہ کی شکل اختیار کی)۔ پس تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور نہ کہو کہ تمین ہیں۔ باز آ جاؤ تمھاری بہتری اسی میں ہے۔ اللہ تو بس ایک ہی الہ ہے۔ وہ بالائے اس سے کہ کوئی

(بقیہ سابق) گزر جانے کے۔ جس طرح یہودیوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے مسیح علیہ السلام کا انکار کیا اور اس میں حد سے گزر گئے اسی طرح عیسائیوں کا جرم یہ ہے کہ انھوں نے مسیح کو مانا اور ماننے میں حد سے گزر گئے۔

(حواشی صفحہ ۱۵۶) اصل میں لفظ کلمہ استعمال ہوا ہے۔ مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مریم علیہا السلام کے رحم پر یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد کے نطفہ سے سیراب ہوئے بغیر حمل کا استقرار قبول کر لے۔ عیسائیوں کو ابتداؤ مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کیا ہی راز بتایا گیا تھا، مگر انھوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو کلام یا "لفظ" (Logos) کا ہم معنی سمجھ لیا، پھر اس کلام و لفظ سے اللہ تعالیٰ کی وہ صفت مراد لے لی جو ہمیشہ سے اس کی ذاتی صفت ہے، پھر یہ قیاس جامع کیا کہ اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم علیہا السلام کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسیدی صورت اختیار کی تھی جو عبارت ہے ذات مسیح سے۔ اس طرح ان کے اندر مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا فاسد عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ بکڑی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے لفظ و کلام کی صفت کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔

اللہ یہاں خود مسیح کو "روح مقدس" (خدا کی طرف سے ایک روح) کہا گیا ہے، اور سورہ بقرہ میں اس مضمون کو یوں ادیکھا گیا ہے کہ "آيَاتُ اللَّهِ بِرُوحِ الْقُدُسِ" (ہم نے پاک روح سے مسیح کی مدد کی)۔ دونوں عبارتوں کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مسیح علیہ السلام کو وہ پاکیزہ روح عطا کی تھی جو جلدی سے نا آشنا، سر اسر حقایق اور راستبازی، اور از سر تا پا فضیلت اخلاق تھی۔ یہی توفیق استجابہ کی عیسائیوں کو بتائی گئی تھی، مگر انھوں نے اس میں بھی غلو کیا، "روح من اللہ" کو عین روح اللہ قرار دے لیا، روح القدس (Holy Ghost) کا مطلب یہ نیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی روح مقدس تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی تھی، اور اس طرح انھوں نے اللہ اور مسیح کے علاوہ روح القدس کو تیسرا الہ بنا ڈالا۔ یہ ان کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

یعنی اللہ کو واحد ماننا اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کر دینا اس میں سے ایک رسول مسیح بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصلی تعلیم تھی اور یہی امر حق ہے جسے ایک سچے پیرو مسیح کو ماننا چاہیے۔
 مسیح یعنی تین الہوں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں تمھارے اندر پایا جاتا ہو حقیقت یہ ہے کہ عیسائی بیک وقت (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کا بیٹا ہو۔ زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں اس کی ملک ہیں اور ان کی کفالت و خبر گیری کے لیے بس وہی کافی

(بقیہ سابق) توحید کو بھی مانتے ہیں اور تثلیث کو بھی۔ مسیح علیہ السلام کے صریح اقوال جو اناجیل میں ملتے ہیں ان کی بنا پر کوئی عیسائی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا بس ایک ہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی دوسرا خدا نہیں۔ ان کے لیے یہ تسلیم کیے بغیر چار نہیں ہے کہ توحید اصل دین ہے۔ مگر وہ جو ایک غلط فہمی ابتداء میں ان کو پیش آگئی تھی کہ کلمتہ اللہ نے مسیح کی شکل میں ظہور کیا اور روح اللہ نے اس میں حلول کیا، اس کی وجہ سے انھوں نے مسیح اور روح القدس کی الوہیت کو بھی خداوندِ عالم کی الوہیت کے ساتھ ماننا خواہ مخواہ اپنے اوپر لازم کر لیا۔ اس زبردستی کے التزام سے ان کے لیے یہ مسدود ایک ناقابل حل مسئلہ بن گیا کہ عقیدہ توحید کے باوجود عقیدہ تثلیث کو، اور عقیدہ تثلیث کے باوجود عقیدہ توحید کو کس مرتبہ بنائیں۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے میں سرکھپا رہے ہیں، بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں، اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے، اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوتے چلے گئے ہیں، اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور صرف ہوا ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی، نہ اس کے بھیجے ہوئے مسیح نے، اور نہ اس مشکل کا کوئی حل ممکن ہے کہ خدا تین بھی مانے جائیں اور پھر وحدانیت بھی برقرار رہے۔ اس مشکل کو صرف ان کے غلو نے پیدا کیا ہے اور اس کا بس ہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں، مسیح اور روح القدس کی الوہیت کا تخیل چھوڑ دیں اور صرف اللہ کو الٰہ واحد تسلیم کر لیں۔

(حواشی صفحہ ۱۵) سلہ یہ عیسائیوں کے چوتھے غلو کی تردید ہے۔ بائبل کے عہد جدید کی روایات اگر صحیح بھی ہوں تو ان سے (خصوصاً پہلی تین انجیلوں سے) زیادہ سے زیادہ بس اتنا ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلق سے تشبیہ دی تھی اور "باپ" کا لفظ خدا کے لیے وہ محض مجاز اور استعارہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، چنانچہ جس طرح انھوں نے اپنے لیے خدا کو باپ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اسی طرح عام انسانوں کے لیے بھی کیا ہے۔ لیکن عیسائیوں نے یہاں پھر غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مظہر ہے اور اس کے کلمے اور اس کی روح کا جسد ہی ظہور ہے اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے، اور خدا نے اپنے اکلوتے پوتے میں پر اس لیے بھیجا کہ انسان کے گناہ اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسانوں کے گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود مسیح علیہ السلام کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اس غلو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متاثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارہ کے عقیدے کی تردید نہیں کی ہے کیونکہ عیسائیوں کے ہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ ہے اور اس سوال کی ایک صوفیانہ تفسیر یہ توجیہ ہے کہ (باقی اگلے صفحہ پر)

مسیح نے کبھی اس بات کو عار نہیں سمجھا کہ وہ اللہ کا ایک بندہ ہو، اور نہ مقرب ترین فرشتے اس کو اپنے بیٹے عار سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اللہ کی بندگی کو اپنے لیے عار سمجھتا ہے اور تکبر کرتا ہے تو ایک وقت آئے گا جب اللہ سب کو گھیر کر اپنے سامنے حاضر کرے گا، اُس وقت وہ لوگ جنہوں نے ایمان لا کر نیک طرز عمل اختیار کیا ہے اپنے اجر پورے پورے پائیں گے اور اللہ اپنے فضل سے ان کو مزید اجر عطا فرمائے گا، اور جن لوگوں نے بندگی کو عار سمجھا اور تکبر کیا ہے ان کو وہ دردناک سزا دے گا اور خدا کے سوا جن جس کی سرپرستی و مددگاری پر وہ بھروسہ رکھتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی وہ وہاں نہ پائیں گے۔

لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن آگئی ہے اور ہم نے تمہاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے جو تمہیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے۔ اب جو لوگ اللہ کی بات مان لیں گے اور اس کی پناہ ڈھونڈیں گے ان کو اللہ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم کے دامن میں لے لے گا اور راہ راست کی طرف ان کی رہنمائی کرے گا۔

لوگ تم سے کھانا کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد (بقیہ سابق) جب مسیح خدا کا اکلوتا تھا تو وہ صلیب پر چڑھ کر لعنت کی موت کیوں مرا۔ لہذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھا گئے تھے۔

علم یعنی زمین و آسمان کی موجودات میں سے کسی کے ساتھ بھی خدا کا تعلق باپ و بیٹے کا نہیں ہے بلکہ محض مالک اور ملک کا تعلق ہے۔

(حواشی صفحہ ۵۸) علم یعنی خدا اپنی خدائی کا انتظام کرنے کے لیے خود کافی ہے، اس کو کسی سے مدد لینے کی حاجت نہیں کہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔

علم یہ آیت اس سورہ کے نزول سے بہت بعد نازل ہوئی ہے۔ بعض روایات تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن کی سب سے آخری آیت ہے۔ یہ بیان اگر صحیح نہ بھی ہو تب بھی کم از کم اتنا تو ثابت ہے کہ یہ آیت سورہ صوری میں نازل ہوئی۔ اور سورہ نسا اس سے بہت پہلے ایک مکمل سورہ کی حیثیت سے پڑھی جا رہی تھی۔ اسی وجہ سے اس آیت کو ان آیات کے (باقی اگلے صفحہ پر)

مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اسی طرح بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکے میں سے دو بھائی کی حقدار ہوں گی اور اگر کئی بھائی بہنیں ہوں تو عورتوں کا اکبر اور مردوں کا دو ہر حصہ ہوگا۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔

(بقیہ سابق) سلسلہ میں شامل نہیں کیا گیا جو احکام میراث کے متعلق سورہ کے آغاز میں ارشاد ہوئی ہیں، بلکہ اسے سورہ کے ضمیمہ کے طور پر آخر میں لگا دیا گیا۔

کالاہ کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض کی رائے میں کالاہ وہ شخص ہے جو لادہ بھی ہو اور جس کے باپ اور دادا بھی زندہ نہ ہوں۔ اور بعض کے نزدیک محض لادہ مرنے والے کو کالاہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ آخر وقت تک اس معاملہ میں متردد رہے۔ لیکن عامۃ فقہار نے حضرت ابو بکر کی اس رائے کو تسلیم کر لیا ہے کہ اس کا اطلاق پہلی صورت پر ہی ہوتا ہے۔ اور خود قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کیونکہ یہاں کالاہ کی بہن کو نصف ترکہ کا وارث قرار دیا گیا ہے حالانکہ اگر کالاہ کا باپ زندہ ہو تو بہن کو سسرے سے کوئی حصہ پہنچتا ہی نہیں۔

(حواشی صفحہ ۱۵۸) یہاں ان بھائی بہنوں کی میراث کا ذکر ہو رہا ہے جو میت کے ساتھ ماں اور باپ دونوں میں یا صرف باپ میں مشترک ہوں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ ایک خطبہ میں اس معنی کی تشریح کی تھی اور صحابہ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا، اس بنا پر یہ مجمع علیہ مسئلہ ہے۔

یعنی بھائی اس کے پورے مال کا وارث ہوگا اگر کوئی اور صاحب فریضہ نہ ہو۔ اور اگر کوئی صاحب فریضہ موجود ہو، مثلاً شوہر، تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔
 یہی حکم دو سے زائد بہنوں کا بھی ہے۔